POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 May 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 02-05-2026 • Price: 5/- • 8-14 May 2026 • Issue: 18 • Vol:85

۸تا۱۴رمئی ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۸ • جلد:۸۵

فلسفہ اور شاعری

محمد بلال رؤف

فلسفہ اور شاعری انسانی آگہی کے دو ایسے نمایاں پہلو ہیں جو بہ ظاہر الگ نظر آتے ہیں، مگر ان کی جڑیں وجدان کی ایک ہی زمین سے منسلک ہیں۔ انسانی تمدن کی تاریخ میں فلسفہ اور شاعری کا رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسانی فکر ہے۔ فلسفہ کائنات کی حقیقت کو 'عقل' اور 'منطق' کے میزان پر پرکھنے کا نام ہے، جب کہ شاعری اسی حقیقت کو 'احساسیت' اور 'جمالیات' کے پیراہن میں ڈھالنے کا عمل ہے۔ یونانی عہدِ قدیم سے لے کر مشرق کے دبستانوں تک، یہ بحث ہمیشہ زیرِ غور رہی ہے کہ کیا شاعر سچائی کا ادراک کرتا ہے یا فلسفی؟

فلسفہ اور شاعری کے درمیان پہلی بڑی خلیج یونان کے دو عظیم دماغوں، افلاطون (Plato 347BC-423BC) اور ارسطو (Aristotle 322BC-384BC) کے دور میں پیدا ہوئی، جب افلاطون نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'الجمہوریہ (The Republic) میں شعرا حضرات پر کڑی تنقید کی اور انھیں اپنی مثالی ریاست سے نکال دینے کی پُرزور حمایت کی۔ دراصل اس کا فلسفہ یہ تھا کہ اصل حقیقت 'عالمِ مثال' (World of Ideas) میں ہے، یہ مادی دنیا اس اصل کی نقل ہے، اور شاعر اس نقل کی بھی نقل کرتا ہے۔ افلاطون نے شعرا پر دو بڑے الزام لگائے:

1- اس کے نزدیک شاعری دراصل حقیقت کی محض ایک پرچھائیں ہے، لہٰذا یہ سچائی سے محروم ہے۔

2- دوسرا اعتراض کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ شاعری انسان کے جذبات اور جبلّتوں کو اکساتی اس کو اشتعال دلاتی ہے، جس سے اس کی عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اپنی تصنیف 'بوطیقا' (Poetics) میں اپنے استاد کے تمام اعتراضات کا علمی جواب دیا۔ ارسطو نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی فلسفہ و ادب کی بنیاد سمجھا ہے:

> "Poetry is something more philosophic and of graver import than history."

ارسطو کے مطابق تاریخ صرف یہ بتاتی ہے کہ 'کیا ہوا'، جب کہ شاعری اور فلسفہ یہ بتاتے ہیں کہ 'کیا ہونا چاہیے' یا عنقریب 'کیا ہو سکتا ہے'۔ جہاں افلاطون نے شاعری کو انسانی جذبات و احساسات کو اشتعال انگیز بنانے کا اعتراض کیا وہی ارسطو نے اپنے فلسفہ 'تطہیر' (Catharsis) کا نظریہ پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ شاعری انسانی جذبات کو بگاڑتی نہیں بل کہ انھیں اعتدال پر لاتی ہے۔ آگے چل کر اسی بحث کے ضمن میں مغربی مفکر جارج سنٹیانا (George Santayana 16 Dec 1863 - 26 Sep 1952) کہتے ہیں:

> "Philosophy is the theory of poetry, as poetry is the practice of philosophy"

ولیم ورڈز ورتھ (William Wordsworth 7 Apr 1770- 23 Apr 1850) کا اس بارے میں خیال تھا کہ شاعری فقط قافیہ پیمائی یا حسنِ بیان کا ہی نام نہیں بلکہ یہ پہلے کسی گہرے احساس سے گزرتی ہے پھر کسی پرسکون لمحے میں شاعر اسے اظہار کی قوت عطا کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Lyrical Ballads, with other poems کے دیباچے میں لکھتا ہے:

> "The spontaneous overflow of powerful feelings: it takes its origin from emotion recollected in tranquility.""

یہی وجہ ہے کہ ان کی خود کی شاعری میں داخلی احساس، فطرت اور سادگی واضح نظر آتی ہے۔ ولیم کے مطابق شاعر ایک ایسا فلسفی ہے، جو قدرت کی چھوٹی چھوٹی اشیا میں کائنات کے بڑے راز دیکھ لیتا ہے۔ جہاں ایک عام فلسفی منطق کی گھتّیوں میں الجھ کر تھک کر رک جاتا ہے، وہاں شاعر کا وجدان اسے آگے تک لے جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کے فلسفہ عموماً استدلال (Reasoning) کا محتاج ہوتا ہے اور ارسطو کے نزدیک فلسفہ کلیات کی بحث ہے، جب کہ افلاطون نے اپنی کتاب 'جمہوریت' (The Republic) میں شاعروں کو مثالی ریاست سے نکالنے کی بات کی تھی کیوں کہ اس کے خیال میں شاعری حقیقت سے دو درجے دور ہے، لیکن اس کے برعکس، انگریزی رومانوی شاعر سیموئل ٹیلر کولرج (S.T. Coleridge) کا ماننا تھا:

> "No man was ever yet agreat poet, without being at the same time a profound philosopher."

اسی طرح انگریزی شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold 22 Dec 1822- 15 Apr 1888) نے کہا تھا:

> "Poetry is at bottom a criticism of life."

آرنلڈ تنقیدِ حیات کے نظریے کے تحت ادب کا رشتہ براہِ راست زندگی سے جوڑتا ہے، وہ سماجی سطح پر زندگی کو تہذیبی اقدار اور روحانی عظمتوں کا حامل دیکھنا چاہتا ہے۔ آرنلڈ کے مطابق شاعری میں مقصدیت کا ہونا بہت ضروری ہے، شاعری بلا مقصد صرف وقت گزاری ہے، شاعر کو محض جذباتی عکاسی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کا ایک واضح مقصد بھی ہونا چاہیے۔ دراصل وہ معاشرتی مسائل شاعری کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے۔ ملک اختر حسین آرنلڈ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آرنلڈ ایسی شاعری چاہتا ہے جو زمانے کے تقاضوں پر پوری اترے۔ وہ شاعر کو سوسائٹی کے تعلق سے دیکھتا ہے، اس سے پہلے کبھی اتنے زوردار انداز میں ادب سے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنا پیش نہیں کیا گیا۔''

دراصل فلسفی سچائی کا سراغ لگانے یا اس تک پہنچنے کے لیے نثر اور منطق کا سہارا لیتا ہے، جہاں اس کے خیالات میں ابہام کی گنجائش نہیں ہوتی، جب کہ اس کے برعکس، ایک شاعر استعارے (Metaphor) اور علامت (Symbol) کے ذریعے وہ بات کہہ جاتا ہے جہاں ہمیں عقل کے پر جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں فلسفہ ختم ہوتا ہے، وہاں سے شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو صوفیانہ شاعری (جیسے مولانا رومی اور فرید الدین عطار) نے فلسفہ وحدت الوجود کو جس خوب صورتی سے بیان کیا، وہ خشک منطقی بحثوں سے ممکن نہ تھا۔ جرمن فلسفی فیڈرک نطشے (Friedrich Nietzsche, 15 Oct 1844- 25 Aug 1900) خود ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ طرز شاعر بھی تھا۔ اس نے کہا کہ جب مذہب اور روایتی اخلاقیات دم توڑ دیں گے، تو صرف 'فن اور شاعری' ہی انسان کو زندگی کے لایعنیت (Absurdity) سے بچا سکیں گے۔ اس کی کتاب Thus Spoke Zarathustra

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

(جس کا ترجمہ ڈاکٹر پروفیسر ابوالحسن منصور احمد صاحب نے بہ عنوان 'بہ قولِ زرُدشت') میں فلسفے اور شاعری کے ملاپ کی بہترین مثال ہے۔

اردو شاعری صرف جذبات کی ترجمان نہیں رہی، بلکہ اس نے مشکل ترین مابعد الطبیعیاتی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ ہمارے شعری سرمایے میں عشق، وجود، حقیقت، زمان و مکان، روح اور کائنات جیسے گہرے موضوعات کو محض فلسفیانہ انداز میں نہیں بلکہ علامت، استعارہ اور تمثیل کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ صوفی شعرا نے ذاتِ انسانی اور ذاتِ مطلق کے تعلق کو شعری پیکر میں ڈھال کر وجودی الجھنوں کو قابلِ فہم بنایا، جب کہ جدید شعرا نے شعور، تنہائی اور کائناتی بے معنویت جیسے مسائل کو فکری اور فنی سطح پر موضوع بنایا۔ یوں اردو شاعری احساس اور ادراک کے امتزاج سے ایک ایسا فکری جہان تشکیل دیتی ہے جہاں جذبہ اور فلسفہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر انسانی وجود کے پیچیدہ سوالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مرزا اسداللہ خان غالبؔ اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے تصوف کو روایتی عقیدت کے بجائے فلسفیانہ نظر سے دیکھا۔ غالبؔ کے ہاں 'ہستی' اور 'عدم' محض مجرد اصطلاحات ہی نہیں بل کہ انسانی شعور، کائنات کی حقیقت اور وجود کے مسئلے پر گہری فکری جستجو کی علامت ہیں۔ غالبؔ ظاہری حقیقت پر قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے پسِ پردہ کارفرما معنوی اور ذہنی جہات کو آشکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذکورہ شعر میں غالبؔ انسان کو خارجی دنیا کے فریب سے خبردار کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ جسے ہم حقیقت سمجھتے ہیں، وہ دراصل خیال اور شعور کا ایک جال ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس شعر میں 'عالم' کو 'حلقۂ دامِ خیال' کہنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کائنات کی حقیقت مطلق اور ناقابلِ سوال نہیں، بلکہ انسانی ادراک اور تصور سے وابستہ ہے۔ یہی نکتہ ہمیں فرانسیسی فلاسفر اور سائنسداں ڈیسکارٹ (Rene Descartes 31 Mar 1596 - 11 Feb 1650) کے فلسفۂ شک (Methodical Doubt) کی یاد دلاتا ہے، جہاں وہ ہر شے کو شک کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے صرف شعورِ ذات کو یقینی حقیقت قرار دیتے ہیں ''یعنی میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں''۔ مرزا اسداللہ غالبؔ نے بھی خارجی ہستی کو حتمی سچ ماننے کے بجائے اسے خیال کے دائرے میں مقید دیکھا ہے۔

مرزا غالبؔ کے بعد اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ وہ دوسرے منفرد شاعر اور مفکر ہیں جنھوں نے فلسفے کو شاعری پر حاوی کرنے کے بجائے اسے اس کا خادم بنا دیا۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے ہاں فلسفہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے، ایک ایسا ذریعہ جو شاعری کو فکری گہرائی، معنوی وسعت اور عملی حرارت عطا کرتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے محض خیالات کو منظوم نہیں کیا بلکہ فلسفے کو جذبۂ حیات میں ڈھال کر پیش کیا، تاکہ وہ قاری کے ذہن ہی نہیں بلکہ اس کے عمل کو بھی متاثر کرے۔ علامہ اقبالؔ فلسفے کو پیش کرنے میں بھی خونِ جگر کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک ایک ایسا فلسفہ جو خونِ جگر سے مشتق نہیں وہ حالتِ مرگ میں ہے:

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اقبالؔ نے مغرب کے جدید فلسفے، خصوصاً ہنری برگساں کے تصورِ حیات اور نطشے کے فلسفۂ فوق البشر و ارادۂ قوت کو مشرقی روحانیت اور تصوف کے سرچشمے، بالخصوص مولانا رومی کی فکر سے ہم آہنگ کیا۔ اس فکری امتزاج سے اقبالؔ نے خودی کا ایسا تصور پیش کیا جو نہ تو عقل پر مبنی ہے اور نہ وجدان پر، بلکہ عقل، وجدان اور عمل کی ایک زندہ ترکیب ہے۔ علامہ اقبالؔ کے نزدیک خودی انسان کی تخلیقی قوت، اس کی آزادی اور اس کے اخلاقی شعور کا مرکز ہے، جو اسے تقدیر کا پابند نہیں بلکہ تقدیر کا معمار بناتی ہے۔

اقبالؔ نے شاعری کو محض جمالیاتی تسکین یا وقتی تفریح کا وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ ان کے نزدیک ایسی شاعری جو فکر سے خالی ہو، محض 'نیرنگِ خیال' ہے جو دل کو بہلانے والی ہو سکتی ہے مگر روح کو غافل رکھے گی۔ اسی کے برعکس جب شاعری میں فلسفہ، مقصد اور حیاتِ انسانی کی رہنمائی شامل ہو جائے تو ایسی شاعری محض فن نہیں رہتی بلکہ 'نبوت کا جزو' بن جاتی ہے، یعنی ایک ایسی بصیرت جو انسان کو خود شناسی، کائنات فہمی اور عملِ صالح کی طرف مائل کرے۔ اسی لیے علامہ اقبالؔ کی شاعری فکر و عمل کے سنگم پر کھڑی نظر آتی ہے، جہاں فلسفہ ایک چراغ کی مانند روشن دکھائی دیتا ہے اور شاعری اس کی روشنی کو زندگی کے راستوں تک پہنچاتی ہے۔

بیسویں صدی کی دو عظیم اور ہولناک جنگوں نے انسان کے بنائے ہوئے تمام اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور فکری فلسفیانہ ڈھانچوں کو اس طرح مسمار کیا کہ وہ اپنی صدیوں پرانی اقدار اور اپنی معنویت کھو بیٹھیں۔ وہ تمام تر اصول جو انسان کو خیر و شر، حق و باطل اور مقصدِ حیات کا واضح تصور دیتے تھے، جنگ کی بربریت، اجتماعی قتل و غارت، اور انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کے سامنے بے بس نظر آئے۔ انہی حالات میں انسان نے خود کو ایک ایسی دنیا میں تنہا پایا جہاں نہ کوئی آسمانی ضمانت باقی تھی اور نہ کسی ازلی اخلاقی نظام پر کامل یقین ممکن رہا تھا۔

اسی فکری اور روحانی بحران کے بطن سے ایک نئے فلسفے نے جنم لیا جس نے روایتی تصوراتِ ماہیت و مقصد کو چیلنج کیا۔ اس فلسفے کے مطابق انسان کسی طے شدہ جوہر یا فطری مقصد کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ پہلے دنیا میں وجود پاتا ہے اور پھر اپنے اعمال، فیصلوں، مشاہدات اور تجربات کے ذریعے اپنی ماہیت خود تخلیق کرتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی

یوں انسان کو اپنی آزادی کا مکمل احساس بھی ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے انتخاب کی بھاری ذمہ داری کا بوجھ بھی اسی کے سر جاتا ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو کسی بیرونی سہارے کے بجائے اس کی اپنی ذات، اس کے شعور اور اس کی عملی زندگی کا مرکز قرار دیتا ہے، جہاں ہر فرد اپنے وجود کے معنی خود متعین کرتا ہے اور اسی بنیاد پر اپنی اخلاقی کائنات تعمیر کرتا ہے۔

فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre, 21 June 1905 - 15 April 1980) اور البیر کامیو (Albert Camus, 7 Nov 1913-4 June 1960) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات بذاتِ خود لایعنی (Absurd) ہے اور اس میں کوئی پہلے سے طے شدہ مقصد نہیں۔ اس فلسفے کا عکس انگریزی شاعری میں ٹی ایس ایلیٹ (T. S. Eliot, 26 Sep 1888 - 4 June 1965) کی نظم 'دی ویسٹ لینڈ' (The Waste Land) میں صاف نظر آتا ہے:

"I will show you fear in a handful of dust."

یہاں ایلیٹ کا فلسفہ زندگی کی بے معنویت اور روحانی بنجر پن کی عکاسی کرتا ہے، جو کہ جدید فلسفے کا خاصہ ہے۔

فلسفہ اور شاعری کے اس تقابلی و تاریخی مطالعے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ یہ دونوں شعبہ ہائے علم متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکمیلی عناصر ہیں۔ اگر فلسفہ انسانی شعور کی 'عمودی' (Vertical) بلندی ہے جو منطق کے سیڑھیاں چڑھ کر ہی آسمانِ حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے، تو شاعری اس شعور کی 'افقی' (Horizontal) وسعت ہے جو انسانی جذبات کے سمندر کو اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

دیکھا جائے تو تاریخ کے ہر موڑ پر جب بھی فلسفہ اپنے خشک منطقی مباحث کی وجہ سے بنجر ہوا، تو پھر شاعری نے اسے اپنے تخیل کے خون سے زندگی بخشی۔ اور جب بھی شاعری محض لفظوں کا کھیل بنتی محسوس ہوئی، تو پھر فلسفے نے اسے فکری وقار عطا کیا۔ جیسا کہ ایمانوئیل کانٹ (Immanuel Kant, 22 April 1724 - 12 Feb 1804) کے فلسفے نے انسانی فکر اور ادراک کی حدود متعین کیں، تو گوئٹے (Johan Wolfgang Von Goethe, 28 Aug 1749 - 22 March 1832) اور ورڈز ورتھ نے ان حدود کے اندر جمالِ فطرت کی نئی کائناتیں دریافت کیں۔ مغرب میں افلاطون کی 'عقلیت پسندی' سے شروع ہونے والا سفر ارسطو کے 'جمالیاتی دفاع' سے ہوتا ہوا ایلیٹ اور سارتر کے 'وجودی کرب' تک پہنچا ہے۔ وہاں شاعری اکثر فلسفے کے متبادل کے طور پر ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ اور مشرق (خصوصاً اردو و فارسی ادب) میں فلسفہ اور شاعری کبھی الگ رہے ہی نہیں ہیں۔ رومی ہوں یا مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ، یہاں شاعر ہی سب سے بڑا فلسفی اور دانائے راز تسلیم کیا گیا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

> The heart is a kind of inner intuition or insight which, in the words of Rumi, feeds on the rays of the sun and brings us into contact with aspects of Reality other than those open to sense–perception.

فلسفہ اور شاعری انسانی روح اور فکر کے دو ایسے پر ہیں جن کے بغیر حقیقت کی بلند فضاؤں میں پرواز ممکن نہیں۔ فلسفہ انسان کو کائنات، وجود اور زندگی کے بنیادی سوالات پر غور و فکر کی کرنے اور اسے سمجھنے میں مدد (Wisdom) کرتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر اشیاے کائنات کے اسباب، نتائج اور باطنی رشتوں کو سمجھنے کی تربیت دیتا ہے۔ جس کے ذریعے انسان صرف ظاہر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ معنی کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور دوسری طرف شاعری انسان کو بینائی (Vision) بخشتی ہے۔ وہ باطنی آنکھ جو حقیقت کو صرف سمجھتی نہیں بلکہ محسوس بھی کرتی ہے، جو دل میں ارتعاش پیدا کر کے سوچ کو زندگی سے جوڑ دیتی ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

جب فلسفہ اور شاعری جدا جدا رہیں تو فلسفہ خشک منطق بن کر رہ جاتا ہے اور جب کہ شاعری محض جذباتی سرشاری بن جاتی ہے، لیکن جب یہ دونوں باہم مل جاتے ہیں تو فکر میں حرارت اور احساس میں ایک سمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی امتزاج سے ایک کامل فکر اور ادراک جنم لیتا ہے جو انسان کو نہ صرف اپنے وجود کا شعور دیتا ہے بلکہ اسے اپنی تہذیب، اخلاق اور مستقبل کی تعمیر پر آمادہ کرتا ہے۔ تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ جن ادوار میں فلسفیانہ دانائی اور شعری بصیرت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئیں وہی زمانے تہذیبی عروج، فکری بیداری اور تخلیقی ارتقا کے استعارے بنے۔ یوں فلسفہ عقل کو راستہ دکھاتا ہے اور شاعری روح کو پر عطا کرتی ہے۔ اور دونوں مل کر انسان کو حقیقت کی وسعتوں تک پہنچاتے ہیں۔

لکچرار اردو، کیڈٹ کالج پیٹارو، سندھ حیدرآباد
Mob. No. 03112422216
E-mail: bilal.rauf@gmail.com

اردو ہندی ڈکشنری

انجمن ترقی اردو (ہند)

قیمت: 300 روپے

اردو ادب کی بساط: خالی ہوتے خانے

ڈاکٹر انیس صدیقی

یہ قصہ کم وبیش پانچ برس ادھر کا ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور نے ریاست کے اردو قلم کاروں کی ایک جامع ڈائرکٹری مرتب کرنے کا عزم کیا اور اس کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری راقم کو سونپی گئی۔ مطلوبہ کوائف کے حصول کی خاطر ایک مفصل سوال نامہ تیار کیا گیا اور اخبارات، سوشل میڈیا نیز شخصی رابطوں کے ذریعے اربابِ قلم تک رسائی کی سعی کی گئی۔ چھے سے آٹھ ماہ کی پیہم تگ و دو کے بعد 360 سوانحی خاکے موصول ہوئے، جنھیں حک و تنقیح کے مراحل سے گزارنے کے بعد 244 قلم کاروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس ڈائرکٹری کے مندرجات جہاں کہنہ مشق ادیبوں، شعرا اور صحافیوں کی جولان گاہ بنے نظر آتے ہیں، وہیں ایک تشویش ناک پہلو یہ بھی اجاگر ہوا کہ ان میں چالیس برس سے کم عمر لکھاریوں کی تعداد پانچ فیصد بھی نہیں ہے۔ یہ اعداد و شمار اس تلخ حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ اردو ادب کی بساط نو آموز قلم کاروں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔

یہ صورتِ حال اس اندوہناک حقیقت کا پیش خیمہ ہے کہ نوخیز نسل کا رشتہ قرطاس و قلم سے ٹوٹ رہا ہے اور ہماری قدیم ادبی روایت اب اس لرزتی ہوئی شمع کی مانند ہے جس کی ضیا مخصوص حلقوں تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔

مادہ پرستی کے غبار میں گم گشتہ یہ نسل شاید یہ فراموش کر بیٹھی ہے کہ ادب سے دوری محض الفاظ سے دوری نہیں، بلکہ اپنی روح، اپنی جڑوں اور ان اعلا اقدار سے انحراف ہے جو انسان کو مٹی کے ڈھیر سے نکال کر 'اشرف المخلوقات' کے منصبِ جلیل پر فائز کرتی ہیں۔ لغوی اعتبار سے 'ادب' تہذیب، شائستگی اور سلیقہ مندی کا استعارہ ہے، جب کہ اصطلاحی مفہوم میں یہ اس تخلیقی جوہر اور اعجاز بیانی کا نام ہے جو انسانی مشاہدات، تجربات اور لطیف قلبی واردات کو الفاظ کے ایسے حسین قالب میں ڈھال دے کہ قاری کا ذوقِ سلیم وجدانی کیفیت سے سرشار ہو جائے۔ سچا ادب محض خشک معلومات کی ترسیل نہیں، بلکہ روح کی پکار اور زندگی کی حقیقی ترجمانی ہے۔ یہ نوجوانوں کے تلاطم خیز جذبات کو توازن، فکر کو وسعت اور اخلاق کو وہ رفعت عطا کرتا ہے جو انھیں ایک بیدار مغز اور ذمے دار انسان بناتی ہے۔

موجودہ عہد میں نوجوان نسل کی شعری و ادبی بیگانگی محض اتفاق نہیں، بلکہ اس المیے کے پسِ پردہ متعدد مسموم عوامل اور معاندانہ محرکات کارفرما ہیں۔ سب سے بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو اب مطالعے کی زبان کے بجائے محض سطحی بول چال کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ ایک وہ دور تھا جب اردو اخبارات اور رسائل ہر گھر کی زینت ہوا کرتے تھے۔ بچوں کی فکری آبیاری کے لیے 'کھلونا' اور 'نور'، خواتین کے لیے 'حجاب'، 'بانو' اور 'خاتونِ مشرق'، جب کہ علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لیے 'بیسویں صدی'، 'شمع'، 'ہما' اور 'شبستان' جیسے جرائد پابندی سے منگوائے جاتے تھے۔ اسی طرح 'ہدیٰ'، 'تجلی' اور 'منادی' جیسے رسائل نہ صرف مذہبی رہنمائی فراہم کرتے بلکہ زبان و بیان کی چاشنی سے بھی روشناس کراتے تھے۔ بدقسمتی سے آج ٹیکنالوجی کی یلغار اور سوشل میڈیا کی بے ہنگم مصروفیت نے کتاب اور قاری کا رشتہ منقطع کر دیا ہے۔ گھروں سے رسائل رخصت ہوئے تو لفظوں کی حرمت اور مطالعے کی روایت بھی دم توڑ گئی۔

نوجوان نسل کی ادب سے دوری کا ایک اور بنیادی سبب انگریزی کا استعماری غلبہ اور لسانی مرعوبیت ہے۔ موجودہ دور میں انگریزی کو 'معاشی ناگزیریت' سے تعبیر کر کے اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ کارپوریٹ کلچر اور اعلا تعلیم کے تقاضوں نے نئی پود میں یہ احساسِ کمتری جاگزیں کر دیا ہے کہ اردو ادب سے لگاؤ شاید ذہنی پسماندگی یا قدامت پرستی کی علامت ہے۔

اردو زبان و ادب سے نئی نسل کی بڑھتی ہوئی دوری کے پسِ پشت جہاں دیگر عوامل ہیں، وہیں اردو اساتذہ کی سہل انگاری اور علمی بے اعتنائی بھی کارفرما ہے۔ وہ اساتذہ، جن کے منصب کا بنیادی تقاضا طلبہ کے تشنہ ذہنوں میں ادبی ذوق کی آبیاری کرنا اور انھیں شعر و سخن کی لطافتوں سے آشنا کرنا ہے، وہ خود شوقِ مطالعہ اور ذوقِ سلیم سے عاری نظر آتے ہیں۔ جب استاد کا اپنا دامنِ علم مطالعے کی وسعتوں سے خالی ہو، تو تدریس کا عمل ایک بے جان اور میکانیکی مشق بن کر رہ جاتا ہے، جو طلبہ کے دلوں میں ادب کے تئیں کوئی کشش پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اساتذہ کی اکثریت میں پایا جانے والا یہ علمی فقدان نہ صرف نئی نسل کو اپنی تہذیبی جڑوں سے کاٹ رہا ہے، بلکہ اردو کی ادبی روایت کی نسل در نسل منتقلی میں بھی سدِ راہ ہے۔ جب تک اساتذہ خود کو مطالعے کی لذت اور علمی جستجو سے منور نہیں کرتے، تب تک نئی نسل میں ادب کا چراغ روشن کرنا ایک خوابِ لاحاصل ہی رہے گا۔

نئی نسل کے ادب سے تغافل کی ایک بڑی وجہ ڈیجیٹل یلغار اور سوشل میڈیا پر پھیلا سطحی مواد ہے، جس کے غلبے نے نئی نسل میں عمیق مطالعے اور فکرِ سلیم کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا ہے۔ اردو ادب کی تفہیم جہاں صبر، ریاضت اور ذہنی غواصی کی طالب ہے، وہاں دورِ حاضر کا نوجوان 'فوری تسکین' کے سحر میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ مطالعے کی اس روایتی ثقاہت کی جگہ اب محض سرسری نظر اور وقتی لذت نے لے لی ہے، جو سنجیدہ علمی ذوق کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔

موجودہ عہد میں نوجوان نسل کی شعری و ادبی بیگانگی محض اتفاق نہیں، بلکہ اس المیے کے پسِ پردہ متعدد مسمومِ عوامل اور معاندانہ محرکات کارفرما ہیں۔ سب سے بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو اب مطالعے کی زبان کے بجائے محض سطحی بول چال کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ ایک وہ دور تھا جب اردو اخبارات اور رسائل ہر گھر کی زینت ہوا کرتے تھے۔ بچوں کی فکری آبیاری کے لیے 'کھلونا' اور 'نور'، خواتین کے لیے 'حجاب'، 'بانو' اور 'خاتونِ مشرق'، جب کہ علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لیے 'بیسویں صدی'، 'شمع'، 'ہما' اور 'شبستان' جیسے جرائد پابندی سے منگوائے جاتے تھے۔ اسی طرح 'ہدیٰ'، 'تجلی' اور 'منادی' جیسے رسائل نہ صرف مذہبی رہنمائی فراہم کرتے بلکہ زبان و بیان کی چاشنی سے بھی روشناس کراتے تھے۔ بدقسمتی سے آج ٹیکنالوجی کی یلغار اور سوشل میڈیا کی بے ہنگم مصروفیت نے کتاب اور قاری کا رشتہ منقطع کر دیا ہے۔

شعر و ادب سے شیفتگی اور قلبی وابستگی، دراصل اس کے رسمِ خط سے مشروط ہے۔ آج کی نوخیز نسل اگر اپنے گراں قدر علمی و ادبی ورثے سے کٹ کر رہ گئی ہے، تو اس کا بنیادی سبب اردو رسمِ خط سے ناآشنائی اور 'رومن اردو' کا وہ غیر فطری چلن ہے جس نے تحریر کے حسن کو گرہن لگا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسمِ خط سے دوری محض چند حروف کی پہچان کھونا نہیں، بلکہ یہ اپنے ماضی، اپنی تہذیبی شناخت اور صدیوں پر محیط علمی سرمایے سے انقطاع کے مترادف ہے۔

الغرض، اردو ادب کی بساط پر خالی ہوتے یہ خانے محض ایک لسانی بحران نہیں بلکہ ہماری تہذیبی اساس کے منہدم ہونے کا پیش خیمہ ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم گھریلو فضا کی ادبی تطہیر ہے۔ والدین پر یہ بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بھلے ہی انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلائیں، مگر انتخاب ایسے اسکولوں کا کریں جہاں تیسری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھائی جاتی ہو، تاکہ بچہ کم از کم اپنی مادری زبان لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائے۔ ساتھ ہی اپنے گھروں میں کتب بینی کی روایت کو دوبارہ جلا بخشیں، کیوں کہ ذوقِ سلیم کی آبیاری کا پہلا مدرسہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہی ہوتا ہے۔ جب تک گھروں میں اردو رسائل اور کتابوں کی خوشبو نہیں بسے گی، نئی نسل کا رشتہ اپنی جڑوں سے استوار نہیں ہو سکے گا۔ نیز وقت کا تقاضا ہے کہ کتاب اور قاری کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو استوار کرنے کے لیے محلوں کی سطح پر مطالعاتی مراکز کے احیا کی سنجیدہ فکر کی جائے۔

دوسرے مرحلے پر ہمیں 'رومن اردو' کے غیر فطری اور مسموم چلن کا سدباب کرنا ہوگا، جس نے نئی نسل کو اپنے ہی رسمِ خط سے بیگانہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اردو کے اصل 'نستعلیق' خط کو فروغ دینا ہوگا تاکہ تحریر کا حسن اور لسانی تشخص برقرار رہ سکے۔ ساتھ ہی، جدیدیت اور روایت کا سنگم تخلیق کرنا وقت کی اہم پکار ہے۔ کلاسکی شاہکاروں کو پوڈکاسٹ، آڈیو بکس اور دیدہ زیب ایپس کے ذریعے نوجوانوں کے ذوقِ جدید کے قریب لانا ہوگا۔ تعلیمی سطح پر نصابِ اردو کو قدامت پسندی کے خول سے نکال کر عصرِ حاضر کے نفسیاتی و معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا، تاکہ اساتذہ اسے محض ایک لازمی مضمون نہیں بلکہ ایک 'تہذیبی امانت' سمجھ کر پڑھائیں۔

اردو کی حقیقی بقا اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ ہم اپنی تہذیبی جڑوں کو ادب کے آبِ حیات سے سیراب کریں۔ یہ محض لفظوں کی بازی گری نہیں، بلکہ ہماری شناخت کی ضامن اور مستقبل کا روشن استعارہ ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ادب کی اس شمع کو دوبارہ فروزاں کریں جو ماضی کی عظمت اور مستقبل کی رفعت کے درمیان ایک پل کا کام کرتی ہے، قبل اس کے کہ اردو ادب کی اس بساط کے سارے خانے خالی ہو جائیں اور ہم اپنی ہی تاریخ کے کھنڈرات میں گم ہو کر رہ جائیں۔

Plot No. 19, Gulmohar Hills,
Ring Road, Gulburagi-585105
Mob. No.: 9342353312
E-mail: draneessiddiqui@yahoo.com

اردو دُنیا

انگریزی تراجم نے اردو شعرا کو عالمی شہرت دلائی

جی. آر. کنول

نئی دہلی (13اپریل)۔حضرت نظام الدین اولیا میں واقع غالب اکیڈمی میں ماہانہ شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی.آر.کنول نے کی۔اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو اور فارسی کے شعرا کو عالمی سطح پر جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس میں انگریزی تراجم نے اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے کہا کہ عمر خیام، رومی، حافظ، غالب اور اقبال کے کلام کے انگریزی تراجم منظرِ عام پر آئے تو انھیں عالمی شہرت نصیب ہوئی۔اس موقعے پر سعودی عرب کے شہر ریاض سے آئے سہیل اقبال کے شعری مجموعے 'سمندر میں دھول' اور سہارنپور کے دانش کمال کی کتاب 'پاکیزہ الفاظ' کی رسمِ اجرا بھی انجام پائی۔نشست میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے جن شعرائے کرام نے شرکت کی وہ حسبِ ذیل ہیں:

ڈاکٹر جی. آر. کنول، متین امروہوی، ظہیر احمد برنی، زاہد علی خاں اثر، سہیل اقبال، دانش کمال، حشمت بھاردواج، عبدالرحمٰن منصور، شائق اعجاز عباسی، ارون شرما، فراز غزل، طلعت سروہہ، رازی ابوذر، شروتی بھٹاچاریہ، عرفان اعظمی، شاہد انور، چشمہ فاروقی، خورشید حیات، عارف حسین، احترام صدیقی، سرفراز احمد فراز، پروین ویاس، ڈاکٹر ویریندر سنگھ ویر، سنجے شکلا تلخ، ڈاکٹر شہلا احمد، سورج پال سنگھ ادنیٰ، انجلی اروڑا خوشبو، ڈاکٹر سنتوش سمپرتی، سدھارتھ آغا، ترون جین، گولڈی گیت، عارف دہلوی، پریم ساگر پریم، گل بہار، سریندر صفر، نعیم ہندستانی، عطاء الرحمٰن، رنگ نگینوی، ہاشم دہلوی اور اشل فواز وغیرہ۔

(انقلاب۔دہلی)

جے.این.یو میں 'شاہ ولی اللہ میموریل لکچر'

نئی دہلی (17اپریل)۔شعبۂ عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام 'ہند و عرب تعلقات کے محرکات' کے عنوان پر بارہواں شاہ ولی اللہ میموریل لکچر منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر شوبھا شیواشنکرن (ڈین اسکول آف لنگویجز) نے کی جب کہ شعبے کے استاد ڈاکٹر خورشید امام نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔نشست کے آغاز میں صدرِ شعبہ پروفیسر محمد قطب الدین نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی و فکری وراثت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔اس کے بعد پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کلیدی خطیب پروفیسر ہمایوں اختر نظمی (اعزازی ڈائرکٹر سنٹر آف وسط ایشیا جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات کو سراہا۔انھوں نے اپنے خطبے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں برِ صغیر میں بیداریِ نو کا علمبردار قرار دیا۔انھوں نے کہا کہ ان کی تعلیمات کا مرکز مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح اور عقلی بنیادوں پر دین کی تفہیم تھا تا کہ وہ سیاسی اور سماجی چیلنجز کا موثر طور پر مقابلہ کرسکیں۔

پروگرام کی صدر پروفیسر شوبھا شیواشنکرن نے صدارتی کلمات میں مقررین کے جامع اور اہم خطاب کی ستائش کی اور کہا کہ موضوع نہایت وسیع اور موجودہ حالات کے تناظر میں حساس تھا، لیکن اسے نہایت علمی انداز میں پیش کیا گیا جو قابلِ تعریف ہے۔نشست کے اختتام پر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے کلماتِ تشکر پیش کرتے ہوئے کلیدی خطیب کا شکریہ ادا کیا۔انھوں نے ڈین پروفیسر شوبھا شیواشنکرن کی سرپرستی اور

انجمن ترقی اُردو جھالاواڑ (شاخ) راجستھان کی پُر وقار و شاندار افتتاحی تقریب کا انعقاد

جھالاواڑ (26اپریل)۔دارالارقم پبلک اسکول، سینٹ جوزف اسکول روڈ، جھالاواڑ میں انجمن ترقی اُردو (راجستھان) کی شاخ انجمن ترقی اُردو، جھالاواڑ (راجستھان) کی افتتاحی تقریب نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی۔ پروگرام کو دو نشستوں میں تقسیم کیا گیا، جس میں پہلی نشست افتتاحی اجلاس جب کہ دوسری نشست میں اُردو مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن کا اہتمام کیا گیا۔

پروگرام کے مہمانِ خصوصی جناب پرکاش چند یوون (چیف بلاک ایجوکیشن آفیسر، جھالراپاٹن) تھے۔معزز مہمانانِ گرامی میں پروفیسر حمید احمد (صدر شعبۂ جغرافیہ، گورنمنٹ کالج، جھالاواڑ)، پروفیسر اقبال فاطمہ (صدر شعبۂ تاریخ، گورنمنٹ کالج جھالاواڑ) اور جناب سریش چندرنگم (صدر، اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد، جھالاواڑ) شامل رہے۔

استقبالیہ کلمات عیان نے پیش کیے۔اس کے بعد انجمن کے صدر ڈاکٹر فہیم الدین ٹونکی نے تعارفی گفتگو پیش کرتے ہوئے ریاستِ جھالاواڑ میں اُردو شعر و ادب کی زرخیز روایت پر روشنی ڈالی۔انھوں نے مہاراجہ بھوانی سنگھ جی اور راؤ راجیند رسنگھ جی کی اُردو ادب کے فروغ میں خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔نیز ریاستی دور اور بعد از آزادی سرگرم رہنے والی ادبی انجمنوں — انجمنِ ادب، بزمِ نیرنگ، بزمِ شفیق وغیرہ — کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خدمات کو سراہا۔

ڈاکٹر فہیم الدین ٹونکی نے انجمن ترقی اُردو ہند کی تاریخ، اغراض و مقاصد اور خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے جھالاواڑ شاخ کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا، اور آئندہ کے مجوزہ پروگراموں اور عملی منصوبوں کا خاکہ بھی پیش کیا۔اس کے بعد انجمن کی مجلسِ عاملہ کا اعلان کیا گیا اور تمام عہدیداران کا گل پوشی کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ نمایاں عہدیداران میں سرپرست راکیش کمار نیر، مشیرِ اعلا پروفیسر حمید احمد اور سید زبیر علی، مشیرِ خاص سریش چندرنگم، صدر ڈاکٹر فہیم الدین ٹونکی، سیکریٹری یونس خان، جوائنٹ سیکریٹری ارمان خان، کنویز شاعرہ اسما خان بہار، میڈیا و ترجمہ انچارج آصف شیروانی، ایڈووکیٹ تنویر، خازن عبدالغنی اور دانش احمد دانش شامل تھے۔

دوسری نشست میں اُردو مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن کا شاندار انعقاد ہوا، جس کی صدارت بزرگ شاعر عظیم بیگ عظیم نے کی۔اسٹیج پر راکیش کمار نیر اور پرکاش چند یوون بھی جلوہ افروز رہے، جب کہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر دانش احمد دانش نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

نوجوان شاعر عیان خان نے شعری محفل کا آغاز کیا۔اس کے بعد کوی تلسی رام تلسی، دیویندر جین گنگنا، چیتن شرما، دھنی رام سمرتھ، عظیم بیگ عظیم، شاعرہ آفرین خاں اور راکیش کمار نایر کے اشعار سے سامعین خوب محظوظ ہوئے۔

پروگرام کے اختتام پر دارالارقم کے ڈائرکٹر سیّد زبیر علی نے تمام مہمانوں، شعرا، کویوں اور معزز حاضرین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس موقعے پر حبیب خان، جاوید خان، وجاہت علی، جگدیش سونی، انیس احمد، رشید میاں، توقیر عالم، صادق بھائی، ریکھا سکسینہ سمیت بڑی تعداد میں ادب کے شائقین شریک تھے۔

مرکز کی ترقی میں ان کے تعاون کو بھی سراہا۔ پروگرام میں پروفیسر انل، پروفیسر عبیدالرحمٰن طیب، پروفیسر اشفاق احمد، ڈاکٹر عبدالقدوس، ڈاکٹر اکرم نواز، ڈاکٹر محمد اجمل، ڈاکٹر اختر عالم، ڈاکٹر عظمت اللہ اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (انقلاب۔دہلی)

شعبۂ اُردو سی سی ایس یونیورسٹی میں 'ساہتیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں' موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ (24-18اپریل)۔بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے غلط فہمیاں رہتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں پوری بات کا علم نہیں ہو پاتا۔ایوارڈ کمیٹی کے انتخاب کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ایوارڈ سے ادیب بڑا نہیں ہوتا صرف حوصلہ ملتا ہے۔یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے پر کوئی بڑا ادیب بن جاتا ہے۔ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار عبدالصمد نے 'ساہتیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں' موضوع پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران کیا۔انھوں نے مزید کہا کہ بہت سے ادیب ایسے بھی ہیں جو واقعی بہت بڑے ادیب ہیں لیکن یہ ایوارڈ ان کو نہیں ملا۔دنیا کا کوئی ایوارڈ ایسا نہیں جس میں تنازع نہ ہو۔اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اُردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے معروف فکشن نگار عبدالصمد اور معروف شاعر چندر بھان خیال اور مہمانِ ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے شرکت کی۔مقررین کی حیثیت سے لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور دہلی سے ڈاکٹر ابوظہیر ربانی موجود تھے۔استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔اس موقعے پر اسلم جمشید پوری نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی، دہلی ایک ایسی اکادمی ہے جو ہندستان کی تقریباً 24 زبانوں کو فروغ دینے کا کام کرتی ہے اور کئی طرح کے پروگرام اکادمی کے ذریعے عمل میں آتے ہیں اور مختلف ادیبوں، دانشوروں کو بلا کر ان کا تعارف اور ان کے خیالات کو ہم تک پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا سیاسی دخل نہیں ہوتا۔چوبیس زبانوں کو یہ اکادمی دیکھتی ہے اور نئے پرانے ادیبوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے کہا کہ میں بڑا فخر محسوس کر رہی ہوں کہ آج بڑے بڑے فکشن نگاروں اور ناقدین کے درمیان پروگرام میں شامل ہوں اور کچھ بول رہی ہوں۔حقیقت میں ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیاں ایسی ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا اور جب مجھے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو مجھے خود یقین نہیں ہوا کہ مجھے یہ ایوارڈ مل رہا ہے۔یہ اکادمی صرف ادیبوں اور شاعروں کو انعامات سے ہی نہیں نوازتی بلکہ ہندستان کی تقریباً 24 زبانوں کی خدمت کر رہی ہے اور علاقائی زبانوں پر کام کرنے والے ادیبوں کو بھی یہ اکادمی سراہتی ہے۔پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام ریسرچ اسکالر اور طالبِ علموں کے لیے بہت اہم ہے۔ آج کے مہمانوں کی گفتگو سن کر بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔

پروگرام کے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ جو لوگ ساہتیہ اکادمی، دہلی سے وابستہ ہیں ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔لسانیات کے اعتبار سے بھی بہت سے کام ساہتیہ اکادمی میں ہوتے ہیں۔ساہتیہ اکادمی، دہلی کے آج تین اہم ستون ہمارے ساتھ میں ہیں۔آج نوجوان نسل کچھ زیادہ مشغول ہوگئی ہے۔35 سال بعد بھی اکادمی میں ادیبوں کی کتابوں پر انعام ملتا ہے۔یہ اکادمی کبھی قیمت کا خیال نہیں رکھتی۔پوری اردو دنیا میں آپ کا پیپر کہاں سے چھپا اور کہاں شائع ہوا، ساہتیہ اکادمی اس بات پر بھی نظر رکھتی ہے۔پروگرام میں ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، سیّدہ مریم الٰہی، محمد شمشاد، سعید احمد سہارنپوری اور دیگر طلبہ و طالبات وغیرہ بھی شریک تھے۔

(ہفت روزہ 'صدائے انصاری' دہلی)

انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی آن لائن توسیعی میٹنگ
اردو کے فروغ کے لیے کئی اہم فیصلے

رانچی (پریس ریلیز،25 اپریل)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی ایک اہم آن لائن توسیعی میٹنگ مورخہ 25 اپریل بروزِ ہفتہ شام سات بجے منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر یاسین انصاری نے کی۔ میٹنگ میں ریاست کے مختلف اضلاع جیسے گڑھوا، دھنباد، جمشید پور، گریڈیہ، مدھوپور، رانچی اور رام گڑھ سے متعدد معزز اراکین و ذمے داران نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ سے معروف افسانہ و ناول نگار اور اردو ایکٹیوسٹ ثمینہ خان نے بھی شرکت کرتے ہوئے قومی سطح پر اردو کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔

میٹنگ میں جھارکھنڈ میں اردو زبان کی موجودہ حالت پر تفصیلی غور وخوض کیا گیا۔ اراکین نے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ جھارکھنڈ میں اردو کو مقامی زبان کے زمرے سے خارج کرنے کے سرکاری اقدامات زبان وثقافت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اس سلسلے میں اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ لیا گیا کہ ریاست کے ہر ضلع میں اس فیصلے کے خلاف منظّم احتجاجی مہم چلائی جائے گی جسے سوشل میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھرپور انداز میں اجاگر کیا جائے گا۔

میٹنگ میں کئی اہم فیصلے بھی کیے گئے، جن میں 2027 کی مردم شماری کے پیشِ نظر اردو کے حق میں بیداری مہم کا آغاز، ہر ماہ ضلع سطح پر جلسوں کا انعقاد، ریاستی سطح پر سہ ماہی میٹنگ کا اہتمام، ممبر سازی مہم میں تیزی لانا اور غیر فعال یونٹس کو فعال بنانے کے لیے خصوصی اقدامات شامل ہیں۔ مزید برآں، آئندہ ماہ وزیرِ اعلا جھارکھنڈ سے ملاقات کر کے اردو مسائل پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی ذمے داری ڈاکٹر یاسین انصاری کو سونپی گئی۔

میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے مختلف مقررین جن میں ڈاکٹر محمد انظر حسین، ڈاکٹر جمشید قمر، محمد ضیاء المبین انصاری، ڈاکٹر ریحانہ محمد علی، ڈاکٹر فرحت جہاں، یاسمین لال، ثمینہ خان، مفتی محمد سعید عالم اور ڈاکٹر اشرف علی نے اردو کے فروغ اور اس کے تحفظ کے لیے متحدہ جدوجہد پر زور دیا۔

اس موقعے پر اسٹیٹ جنرل سکریٹری ایم زیڈ خان نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ انجمن کا بنیادی مقصد جھارکھنڈ میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانا ہے جس کے لیے تنظیم کو مزید مضبوط اور فعال بنانے کے ساتھ ساتھ اردو بولنے والی آبادی تک مؤثر رسائی ضروری ہے اور جہاں اب تک کسی سبب سے ضلع کمیٹی کی تشکیل نہیں ہو پائی ہے، وہاں متعلقہ کمشنری کے انچارج کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ وہ جلد از جلد عملی پہل کرتے ہوئے کمیٹیاں تشکیل دیں۔ اس مقصد کے لیے پورے جھارکھنڈ کو پانچ کمشنریوں میں تقسیم کر کے 14 انچارج مقرر کیے گئے ہیں، جن کے ذمے انجمن کی سرگرمیوں کو تیز کرنا اور میعادِ کار ختم ہونے سے قبل جمہوری طریقے سے انتخابات کرانا بھی شامل ہے۔

میٹنگ کے اختتام پر اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور اس کے آئینی حقوق کے حصول کے لیے ہر ممکن جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔

افضل منگلوری 'عنوان چشتی ایوارڈ' سے سرفراز

دیوبند (31مارچ)۔ دہرادون میں واقع چیف منسٹر ہاؤس میں اتراکھنڈ کے وزیرِ اعلا پشکر سنگھ دھامی کے ہاتھوں معروف شاعر و اتراکھنڈ اردو اکادمی کے سابق نائب صدر افضل منگلوری کو ریاست اتراکھنڈ کا سب سے بڑا اردو ادب کا ایوارڈ 'اتراکھنڈ گورو سمان عنوان چشتی ایوارڈ 2025' سے نوازا گیا۔ افضل منگلوری کی اردو میں طویل مدتی ادبی خدمات کے صلے میں سی ایم دھامی کے ہاتھوں ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے کا چیک، شال، ایوارڈ اور توصیف نامہ پیش کر کے ان کا اعزاز کیا گیا۔ وزیرِ اعلا پشکر سنگھ دھامی نے افضل منگلوری کی ادبی و سماجی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو اتراکھنڈ کا اردو کا نمائندہ شاعر قرار دیا۔ اس موقعے پر اتراکھنڈ سرکار کے وزیر برائے سماجی فلاح و بہبود و اقلیتی امور اور زبان و ادب خزان داس، وزیرِ صحت سوبھو داد نیال اور رکن اسمبلی سویتا کپور وغیرہ موجود تھے۔ نظامت جرنلسٹ سُشیل اپادھیاے نے کی۔ ڈائرکٹر بھاشا مایاوتی ڈکرال نے کہا کہ افضل منگلوری نے وطنِ عزیز میں اتراکھنڈ کا نام روشن کیا ہے اور ان کی آٹھ کتابیں آ چکی ہیں۔ دیگر زبانوں میں اتراکھنڈ گورو سمان 2025 پانے والے ادیبوں میں ڈاکٹر جیتن ٹھاکر، ڈاکٹر بدھ ناتھ مشر، ڈاکٹر یشونت کٹوچ، شیام سنگھ کٹیلا، ڈاکٹر پریتم سنگھ، کیسر سنگھ رائے، ڈاکٹر دیا بھٹ، پروڈینیش چمولا شیلیش، بھوپندر بشٹ، سدھا جوگران، دیوا بھٹ، تارا پاٹھک، شیش پال گوسائی، نیرج پنت، ہیمنت بشٹ، انل کرکی، راجندر ڈھیلا، جگند رنوٹیال، سچن چوہان وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ (انقلاب۔دہلی)

ایان ایجوکیشنل سوسائٹی
اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے اشتراک سے
فیضؔ پر سمینار منعقد

رائے بریلی (یکم اپریل)۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری قاری کے دل میں امید کی شمع روشن کرتی ہے اور اسے بہتر معاشرے کی جدوجہد کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی اتنا ہی مقبول اور معنویت سے بھرپور ہے جتنا اپنے دور میں تھا۔ فیضؔ نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی جس میں محبت اور انقلاب ایک دوسرے کے ہم سفر نظر آتے ہیں، اور یہی ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اوصاف (ہیومنیٹیرین گروپ آف اسکولز) نے ایان ایجوکیشنل سوسائٹی کے مالی اشتراک سے منعقد سمینار 'فیض احمد: حیات و خدمات' الحمد پبلک ہائی اسکول رائے بریلی میں پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمانِ خصوصی محمد معوذ (پرنسپل الحمد پبلک اسکول) نے کہا کہ فیضؔ کی شان میں رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ محبوب سے گفتگو کرتے ہوئے بھی دراصل سماج کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جہاں عشق کی لطافت ہے وہیں انقلاب کی للکار بھی سنائی دیتی ہے۔ مہمانِ ذی وقار اور سماجی کارکن سیّد عقیل احمد نے کہا کہ بلاشبہ فیضؔ اردو ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانی فضا میں کی لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور انقلابی سوچ کے زیرِ اثر یوں ہوا کہ رومانویت اور انقلابی منڈیروں پر ان کی شاعری کا دِیا کبھی مدھم تو کبھی تیز روشنی کے ساتھ جلتا رہا۔ مہمانِ اعزازی اور سینئر صحافی ہمایوں چودھری نے کہا کہ فیضؔ کی شاعری اردو ادب کا ایک درخشاں باب ہے جس میں محبت، انقلاب، انسانیت اور امید کے رنگ نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک حساس دل رکھنے والے انسان بھی تھے، جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعے سماجی ناانصافیوں، جبر اور ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ مقالہ نگاروں جیسے ڈاکٹر سیّد محمد صبیح، ڈاکٹر سیما صدیقی، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، نکہت زہرا اور ڈاکٹر ارشاد احمد خاں بیاروی وغیرہ نے کہا کہ فیضؔ کی شاعری جوان جذبوں کی شاعری ہے۔ یہ جذبہ خواہ وہ انقلاب سے تعلق رکھتا ہو یا محبت سے۔ فیضؔ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی احساس کو، جمالیاتی احساس پر انقلابی آہنگ کو قربان نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے ایک نیا شعری رچاؤ پیدا کیا، ان کی شاعری میں جو دلآویزی، دل آسانی، نرمی اور قوتِ شفا ہے وہ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ پروگرام کی خوب صورت نظامت اپنے مخصوص لب و لہجے میں مصنفہ ڈاکٹر سیما صدیقی نے کی اور مہمانان اور مقالہ نگاروں کا نہایت معیاری اور ان کے شایانِ شان تعارف کرایا۔ سمینار میں افتتاحی کلمات کنوینز مشاعرہ اور سوسائٹی کے سکریٹری ہدایت اللہ بیگ نے ادا کیے۔ اس موقعے پر کلثوم واحد اور ہدایت بیگ نے مہمانوں و مقالہ نگاروں کی گل پوشی اور شال، مومنٹو و تحائف دے کر عزت افزائی کی۔ اس پروگرام میں اسکول کے بچوں نے تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ پاک کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

محسنہ قدوائی کے انتقال پر اظہارِ تعزیت

نئی دہلی (8اپریل)۔ کانگریس کی سینئر لیڈر اور سابق مرکزی وزیر محسنہ قدوائی کا دہلی کے ایک نجی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھیں اور زیرِ علاج تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر سامنے آتے ہی سیاسی، سماجی اور ادبی حلقوں میں گہرے رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ قابلِ ذکر ہے کہ محسنہ قدوائی طویل عرصے تک ہندستانی سیاست میں سرگرم رہیں۔ وہ اپنی صاف شبیہ، عوامی خدمت اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کی جانے والی کوششوں کے حوالے سے جانی جاتی تھیں۔ ان کا شمار کانگریس کی باوقار اور تجربہ کار قیادت میں ہوتا تھا۔ ان کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے عہدیداران نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اسے قومی اور تہذیبی سطح پر بڑا نقصان قرار دیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس بدر دریز احمد نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ مرحومہ ایک قابل، حوصلہ مند اور باوقار خاتون تھیں، جن کے انتقال سے نہ صرف سیاسی میدان بلکہ تہذیبی سطح پر بھی ایک خلا پیدا ہوگیا ہے، جسے طویل عرصے تک محسوس کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ محسنہ قدوائی کی غالب انسٹی ٹیوٹ سے گہری وابستگی رہی اور اہم مواقع پر انھوں نے ادارے کی بھرپور معاونت کی۔ ادارے کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے بیان میں کہا کہ بیگم محسنہ قدوائی ایک تجربہ کار اور مدبر سیاسی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ دردمند اور منصوبہ ساز رہنما بھی تھیں جنھوں نے عوامی خدمت، سماجی بہبود اور قومی سطح پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا انتقال ذاتی طور پر اور ادارے کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ مرحومہ کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ان کے مشن کو آگے بڑھانا ہی اصل خراجِ عقیدت ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادارے کی فلاح و ترقی کے لیے ان کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔

دوسری جانب انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی میں سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کی سینئر رہنما محسنہ قدوائی کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مرحومہ کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ واضح رہے کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی ہمشیرہ محسنہ قدوائی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 94 برس تھی۔ ان کے انتقال سے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ تعزیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ محسنہ قدوائی ایک علم دوست اور باوقار شخصیت کی مالک تھیں جو ہمیشہ خندہ پیشانی اور محبت سے سب سے پیش آتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ مرحومہ اپنی مصروفیات کے باوجود انجمن ترقی اردو (ہند) کے پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت کرتی تھیں اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے منصوبوں کو سراہتی تھیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کے انتقال سے انجمن ایک ایسے سرپرست سے محروم ہوگئی ہے جن کے مشورے اور رہنمائی سے ادارے کو تقویت ملتی تھی۔ اس موقعے پر انجمن کے اراکین نے مرحومہ کے لیے دعاے مغفرت کی اور ان کے اہلِ خانہ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ (انقلاب۔دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : جیتے جی الٰہ آباد
ترتیب : ممتا کالیا
ضخامت : 192 صفحات
قیمت : 299 روپے
ناشر : 1-B، نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی-2
تبصرہ نگار : پروفیسر مشتاق احمد

Mob. No. 9431414586
E-mail: rm.meezan@gmail.com

حسبِ سابقہ 2025 کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ادب کا اعلامیہ جاری ہو چکا ہے۔اس سال ہندستان کی مختلف زبانوں کے کل 24 شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار اور ادبا کو ساہتیہ اکادمی انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اس سال اردو کے لیے پرتپال سنگھ بیتاب کو ان کے شعری مجموعے 'سفر جاری ہے' پر انعام ملا ہے جب کہ ہندی کی ایک قدآور ناول وافسانہ نگار محترمہ ممتا کالیا (2 نومبر 1940) کی یادداشت 'جیتے جی الٰہ آباد' کو اس انعام کے لیے منتخب کیا گیا۔ ہندی ادب کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ممتا کالیا جدید ہندی ادب کی ان ادیبوں میں شامل ہیں جنھوں نے شہری زندگی، متوسط طبقے کے مسائل اور ادبی فضا کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ ان کی ایک اہم تصنیف 'جیتے جی الٰہ آباد' (2021) دراصل ایک یادداشت نما کتاب ہے جس میں شہر الٰہ آباد (موجودہ پریاگ راج) کی ادبی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو نہایت دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کو ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے Valley of Words Book Award سے بھی نوازا گیا تھا، جس سے اس کی ادبی اہمیت مزید نمایاں ہو گئی۔ یہ کتاب محض ایک شہر کی یادوں کا بیان نہیں بلکہ دراصل ہندی ادب کے ایک سنہری عہد کی تہذیبی تاریخ بھی ہے۔ اس میں مصنفہ نے ان ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے خاکے پیش کیے ہیں جن کے بغیر جدید ہندی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔واضح ہو کہ محترمہ ممتا کالیا کی اب تک 25 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان کی طالبہ رہی ہیں اور بطور انگریزی لکچرار تدریسی خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔ وہ دو دہائیوں تک الٰہ آباد میں ایک کالج کی پرنسپل رہی ہیں اور 2001 میں سبکدوشی کے بعد بھی ادبی سرگرمیوں میں شامل رہیں، بالخصوص بھارتیہ بھاشا پریشد کے لیے قدرے زیادہ فعال رہی ہیں۔انھیں 2017 میں ان کے ناول 'دکھم سکھم' کے لیے بیاس سمّان بھی ملا تھا۔ان کے ناولوں میں 'بے گھر' (1971)، نرک درنرک (1975)، پریم کہانی (1980)، ایک پتنی کے نوٹس (1997)، دُکھّم سُکھّم (2009)، دوڑ (2025) کو نہ صرف ہندی ادب بلکہ دیگر ہندستانی ادب میں بھی مقبولیت اور قبولیت حاصل ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں 'چھٹکارا'، 'ایک عدد عورت' اور 'جانچ ابھی جاری ہے' کو بھی بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ دراصل برِّصغیر میں بعض شہر صرف جغرافیائی شناخت نہیں رکھتے بلکہ تہذیب وادب کی علامت بن جاتے ہیں۔ الٰہ آباد بھی ایسا ہی شہر ہے جہاں ہندی کے ہریونش رائے بچن، مہادیوی ورما، سمترا انندن پنت، اور سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا اور اردو کے فراق گورکھ پوری، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہم شعرا وادبا کی مجلسیں آباد رہی ہیں اور ان بڑے ادیبوں نے ادب کی شمع روشن کی۔ یہی شہر ہندی صحافت، ادب اور دانشوری کا مرکز بھی رہا ہے۔ممتا کالیا نے اپنی کتاب میں اسی ادبی ماحول کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الٰہ آباد صرف ایک شہر نہیں بلکہ ایک فکری فضا کا نام ہے جہاں ادیب، شاعر اور طالبِ علم ایک زندہ مکالمے کا حصہ تھے۔کتاب میں وہ لکھتی ہیں:

''الٰہ آباد صرف گلیوں اور عمارتوں کا شہر نہیں، یہ یادوں، گفتگو اور ادبی نشستوں کا شہر ہے۔''

یہ اقتباس دراصل اس شہر کی روح کو بیان کرتا ہے۔'جیتے جی الٰہ آباد' بنیادی طور پر ادبی یادداشتوں کی کتاب ہے۔اس میں مصنفہ نے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے ذریعے شہر کے ادبی ماحول کو بیان کیا ہے۔کتاب میں تین اہم پہلو نمایاں ہیں: (1) ادبی شخصیات کے خاکے (2) شہر کی تہذیبی زندگی (3) مصنفہ کی ذاتی یادیں اور تجربات۔ یہ تینوں عناصر مل کر اس کتاب کو محض یادداشت نہیں بلکہ ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کئی اہم ادیبوں کے دلچسپ اور جاندار خاکے ملتے ہیں۔ممتا کالیا نے ان شخصیات کو نہ صرف بطورِ ادیب بلکہ بطورِ انسان بھی پیش کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں کہ الٰہ آباد کی ادبی محفلیں صرف علمی مباحث تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ وہاں دوستی، طنز ومزاح اور تخلیقی مکالمہ بھی ہوتا تھا۔ایک مقام پر وہ لکھتی ہیں:

''ہم نے ادب کو صرف کتابوں میں نہیں دیکھا بلکہ اسے جیتے جاگتے انسانوں میں محسوس کیا''۔

یہ اقتباس اس کتاب کے بنیادی مزاج کو واضح کرتا ہے۔'جیتے جی الٰہ آباد' میں شہر اور تہذیب کے تعلق کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ کے نزدیک ایک شہر صرف عمارتوں اور سڑکوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ ثقافت کا نام ہے۔الٰہ آباد کی گلیاں، یونیورسٹی، ادبی نشستیں اور چائے خانوں کی گفتگو اس کتاب میں زندہ ہو جاتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

''الٰہ آباد میں چائے کی میز بھی ایک ادبی مجلس ہوتی تھی''۔

یہ جملہ دراصل اس شہر کے فکری ماحول کو ظاہر کرتا ہے۔اس کتاب میں بیسویں صدی کے اس ادبی دور کا ذکر بھی ملتا ہے جب الٰہ آباد ہندی ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں سے کئی اہم ادبی رسائل شائع ہوتے تھے اور ادیبوں کی باقاعدہ نشستیں ہوتی تھیں۔ممتا کالیا نے اس دور کو یاد کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس زمانے میں ادب صرف ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک زندگی کا انداز تھا۔ان کے الفاظ میں:

''ادب ہمارے لیے مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کا حصہ تھا''۔

یہ اقتباس اس زمانے کے ادبی ماحول کی جھلک پیش کرتا ہے۔ممتا کالیا کی زبان سادہ، رواں اور مکالماتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں ایک فطری دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے اسلوب کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں: (1) سادہ اور رواں زبان (2) طنز ومزاح کا ہلکا عنصر (3) مشاہدے کی گہرائی (4) جذبات اور حقیقت کا امتزاج۔اسی اسلوب کی وجہ سے 'جیتے جی الٰہ آباد' ایک دلچسپ اور دل نشیں کتاب بن گئی ہے۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب کئی حوالوں سے اہم ہے۔

یہ کتاب دراصل نصف صدی کے دورانیہ پر مبنی ہے کہ مصنفہ نے اس میں آزادی کے بعد 1950 سے 2020 تک کے ادبی، سماجی اور کہیں کہیں سیاسی منظرنامے کو بھی تخلیقیت کا روپ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہندی ادب کے ایک اہم دور کی دستاویز بن گئی ہے۔اس میں اس زمانے کے ادیبوں اور ادبی فضا کا زندہ بیان ملتا ہے۔ کتاب میں ذاتی یادداشتیں بھی ہیں اور ادبی معلومات بھی۔ یہی امتزاج اسے منفرد بناتا ہے۔مصنفہ نے الٰہ آباد کے تہذیبی ماحول کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔اگرچہ یہ کتاب اپنی نوعیت میں اہم ہے، تاہم بعض ناقدین کے مطابق اس میں چند کمزوریاں بھی ہیں مثلاً بعض جگہ ذاتی یادیں زیادہ غالب آجاتی ہیں، ادبی شخصیات کے تجزیے میں بعض اوقات جذباتیت بڑھ جاتی ہے، لیکن یہ کمزوریاں اس کتاب کی مجموعی اہمیت کو کم نہیں کرتیں۔

'جیتے جی الٰہ آباد' کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ کتاب ہمیں ایک ایسے شہر کی ادبی روح سے آشنا کرتی ہے جو کبھی ہندستان کے ادبی منظرنامے کا مرکز تھا۔ یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ادب صرف کتابوں میں نہیں بلکہ شہروں، گلیوں اور لوگوں کی زندگی میں بھی موجود ہوتا ہے۔ممتا کالیا کی کتاب 'جیتے جی الٰہ آباد' ایک یادگار ادبی تصنیف ہے جو شہر الٰہ آباد کی تہذیبی اور ادبی تاریخ کو زندہ کر دیتی ہے۔اس میں مصنفہ نے نہ صرف اپنی یادوں کو محفوظ کیا ہے بلکہ ایک پورے عہد کی ادبی فضا کو بھی محفوظ کر لیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ شہر صرف جغرافیہ نہیں ہوتے بلکہ تہذیب، ادب اور یادوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔اسی لیے امید کی جاتی ہے کہ 'جیتے جی الٰہ آباد' کو معاصر ہندی ادب میں ایک اہم یادداشت اور ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ◆◆

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی ان کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویر کول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-

افتخار اعظمی: جنھیں بھلا دیا گیا

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

قصائد ومراثی وغیرہ کی شبلی اور دوسرے اربابِ علم وکمال نے جو تحسین و ستائش کی ہے، اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قصائد کے بعد ان کی غزلیہ شاعری اور اس میں اہلِ علم ونظر اور صاحبِ شعر وادب کے تاثرات کو بھی مرحوم افتخار اعظمی نے تسلسل سے نقل کر کے ان پر نقد وتبصرہ کیا ہے۔

ہماری ادبی تاریخ بالخصوص شعری تاریخ میں جگر واصغر کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں، مثلاً دونوں ہم عصر اور ہم زلف تھے۔ دونوں کا طرزِ شاعری اگرچہ الگ الگ تھا، مگر دونوں کا عہد اور ان کے متنوع اوصاف ایک جیسے تھے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ دونوں کی اٹھان کا مرکز ایک تھا، مرکزِ ادب اعظم گڑھ۔ مولانا اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد جو ہم وطن اور علی گڑھ میں ہم سبق بھی تھے۔ مرزا احسان احمد نے جگر کو چشمہ فروشی سے نکال کر اور ان کے مجموعے 'داغِ جگر' پر نہایت شاندار مقدمہ لکھا اور انھیں ادبی دنیا میں ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے پہلی بار متعارف کرایا۔ اسی طرح اقبال سہیل نے اصغر گونڈوی کے پہلے مجموعۂ کلام 'نشاطِ روح' پر نہایت عمدہ مقدمہ لکھا۔ یہ مقدمہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ افکارِ سہیل میں وہ ناقدانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس نوع کی ان کی تحریریں بعض دوسرے شعری مجموعوں مثلاً یحییٰ اعظمی کے مجموعے 'نوائے حیات' میں بھی شامل ہیں۔ اسی مقدمے میں سہیل صاحب نے اپنے شاگرد یحییٰ اعظمی پر فخر وانبساط کا اظہار کیا ہے۔

افتخار اعظمی نے علامہ سہیل صاحب کی بدیہہ گوئی کے ذکر پر مشتمل ان کا یہ مشہور واقعہ جو سہیل مرحوم کے اور بھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے، یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سہیل کے نزدیک غالب: سعدی اور عرفی وغیرہ کی صف میں آتے ہیں۔ ذوق سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ خواجہ امیر احمد انصاری پانی پتی جو ذوق کے بڑے شیدائی تھے، بلیا میں ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر عبدالغنی انصاری صاحب کے یہاں مقیم تھے، سہیل کا بھی وہیں قیام تھا، خواجہ احمد انصاری اپنے ساتھ ذوق کا دیوان لائے تھے۔ سہیل نے کہا 'آزاد نے انتخاب اچھا نہیں کیا۔' خواجہ صاحب بولے 'آپ کو اس کا حق حاصل نہیں ہے، کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ میں ذوق کی کوئی غزل منتخب کروں اور آپ ابھی اس کا جواب لکھ سکیں۔' سہیل مرحوم آمادہ ہو گئے۔ خواجہ امیر احمد نے ایک غزل منتخب کی، جس کا مطلع یہ ہے:

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں اس کے شورِ بِاَیِّ ذنبٍ قتلتنی ہے

سہیل مرحوم نے اسی وقت فی البدیہہ ذوق کی اس غزل کا جواب لکھا، چند چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حریمِ دل میں وہ حسن مطلق جو برسرِ جلوہ افگنی ہے
تو محرمانِ وصال کے لب پہ ہٰذہٖ ما وعدتنی ہے
(سہیل)

نہ کیوں ہو آنکھوں کو جائے ابرو کہ اوج فیض فروتنی ہے
ہوا تواضع سے جب خمیدہ بڑھی مہ نو کی روشنی ہے
(سہیل)

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کی فروتنی ہے
(ذوق)

دو روزہ رفعت پہ نازمت کر کہ بحرِ ہستی کے جزر ومد میں
یہ گنبدِ چرخ بھی کسی دن حباب آشا شکستنی ہے
(سہیل)

لگا نہ اس بت کدے میں تو دل، یہ ہے طلسمِ شکست غافل
کہ کوئی کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے
(ذوق)

کمال یہ ہے کہ مثلِ گوہر نہ محو تہ آب دامن تر
رہے فلک بے گنہ فلک پر تو کون سی پاک دامنی ہے
(سہیل)

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین ودامن
کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
(ذوق)

سہیل کی یہ غزل ان کی مہارتِ فن، ان کے قدرتِ کلام اور ان کی بے پناہ بدیہہ گوئی کی مثال ہے۔ پھر بھی اقبال سہیل کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اگر ذوق کی یہ غزل:

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں!

منتخب کی جاتی تو میں شاید قیامت تک جواب نہ لکھ سکتا۔'

(ذکرِ سہیل، اردو ادب نمبر 2، ستمبر 1956، ص:64-65)

مولانا اقبال احمد سہیلؔ ایک بڑے پایے کے غالب شناس تھے۔ اس حوالے سے ان کے متعدد افکار وخیالات ملتے ہیں۔ راقم نے عرصہ ہوا ایک مقالہ 'اقبال سہیل کی غالب شناسی' لکھا تھا۔ اس میں اقبال سہیل کی غالب (1797-1869) سے بڑھی ہوئی عقیدت کا ذکر کیا ہے۔ نیز فکر و فن کے لحاظ سے غالب کو ذوق (1790-1854) پر فوقیت دینے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم نے ذوق سے بڑا فن کار مرزا غالب کو ثابت کیا ہے۔ انھیں ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ ایم اے او کالج علی گڑھ کی فضا ذوق کے نغموں سے معمور تھی، چناں چہ انھوں نے ثابت کیا کہ فنی لحاظ سے مرزا غالب ذوق سے بڑے شاعر تھے۔

'ذکرِ سہیل' میں مذکورہ بالا فی البدیہہ غزل کہنے کے واقعے کے بعد آبروے شاعری میر تقی میر (1723-1810) اور غالب کا موازنہ ہے اور افتخار اعظمی نے اس موازنے سے اقبال سہیل کے نزدیک مرزا غالب کی فکری وفنی بلندی دکھائی ہے۔ دونوں کے اشعار اور 'سہروں' سے موازنہ کر کے اس کی متعدد مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ بریں متعدد شعرائے اردو سے بھی موازنہ کیا ہے۔ شبلی و حالی اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

''شبلی کی شاعرانہ حیثیت ان (سہیل) کے نزدیک بہت بلند ہے۔ وہ کہتے تھے کہ 'حالی کے یہاں تو کہیں کہیں پھیکا پن آجاتا ہے، لیکن شبلی لطافتِ سخن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔' غالب کے بارے میں ان کی یہ رائے نہایت صائب تھی کہ انھوں نے شعرائے فارسی سے اخذ و استفادہ ضرور کیا ہے لیکن تغیر اور اضافے سے اپنے اشعار کو بلند تر بنا دیا ہے۔ (ذکرِ سہیل، ص65)

افتخار اعظمی نے مولانا سہیل مرحوم کا متعدد شعراے فارسی سے بھی موازنہ ومقابلہ ان کی شاعری کے حوالے سے کیا ہے، جو سہیل صاحب کے 'گنجینۂ تحقیق پر نقد وتبصرے' مطبوعہ ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ سے ماخوذ ہے۔ غزل گوئی کے سلسلے میں علامہ سہیل کی آرا اور خیالات بھی افتخار اعظمی نے نقل کیے ہیں۔ اسی میں شاعری اور ادب کے افادی اور غیر افادی پہلوؤں پر بحث وتنقید شامل ہے اور اس کے متعلق سہیل مرحوم کی آرا نقل کی گئی ہیں۔ یہی نہیں قدرے تفصیل سے ان کی شاعری کے ایک ایک پہلو اور ان کی ایک ایک شاعرانہ خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور ان کے اشعار وکلیات سے متعدد مثالیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال احمد سہیل کا افتخار اعظمی نے بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی سیاسی فکر اور تقسیمِ ہند، جس کے وہ شدید مخالف تھے، ان سے متعلق خیالات ونظریات بھی پیش کیے ہیں اور دوسرے تمام ملّی مسائل اور ان کے بارے میں سہیل مرحوم کی آرا نقل کی گئی ہیں۔

سہیل مرحوم کی نعتیہ شاعری، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (571-632) سے ان کی بے پناہ عقیدت وشیفتگی کے جذبات و احساسات پر مبنی اشعار نقل کر کے اس کی صراحت کی گئی ہے کہ 'ذکرِ سہیل' اگرچہ ایک مقالہ کی صورت میں مجلّہ 'اردو ادب' علی گڑھ میں شائع ہوا ہے، تاہم اس کی حیثیت ایک کم ضخامت کی کتاب کی ہے۔ اگر اس کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے تو زیرِ نظر مقالہ خود ایک کتاب بن جائے گا۔ ضرورت ہے کہ 'ذکرِ سہیل' کو کتابی صورت میں اہتمام سے علاحدہ شائع کیا جائے، اس لیے کہ افتخار اعظمی نے دیدہ وشنیدہ دونوں باتیں تسلسل سے نہایت شگفتہ انداز میں لکھی ہیں۔ آج کا مصنف ان دونوں پہلوؤں اور ان پر یکساں قدرت ومہارت کے ساتھ کیوں کر قلم اٹھا سکتا ہے؟ آخر میں علامہ سہیل کی وفات اور ان کے ماتم کا ذکر ہے۔ اس کا خاتمہ درج ذیل ماتمی سطور پر ہوا ہے:

سہیل کے ساتھ ساتھ ذہانت، فطانت، خوش طبعی، ظرافت، بذلہ سنجی اور رسم خلوص ومحبت اٹھ گئی، وفات سے چند ماہ پیش تر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی، میں نے ان سے کہا 'چند دنوں میں علی گڑھ چلا جاؤں گا، میرے آٹوگراف میں کچھ ہدایتیں لکھ دیجیے۔' کہنے لگے 'میرے پاس ہدایتیں کیا ہیں، لاؤ ایک شعر لکھ دوں، اس شعر میں میری زندگی کی صحیح تصویر چھپی ہوئی ہے۔ شاید یہ شعر تمھیں جینے کا سلیقہ سکھا سکے۔

نکہتِ گل کی طرح عمر بسر کی اقبالؔ
راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

(ذکرِ سہیل، مشمولہ اردو ادب، علی گڑھ، شمارہ 2، ص:124)

افتخار اعظمی کی رہائش لکھنؤ میں جہاں گیر آباد پیلس میں تھی، جو کسی نواب کی کوٹھی تھی اور جس میں ان سے پہلے ان کے بڑے والد عبدالغنی صاحب انکم ٹیکس افسر رہتے تھے۔ جہاں گیر آباد پیلس بڑی شہرت رکھتا تھا۔ افتخار اعظمی کا یہاں بڑا ٹھاٹ باٹ تھا، اسی کے ایک گوشے میں مرکزِ ادب قائم کر رکھا تھا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ علامہ سہیل کے دونوں مجموعے اسی مرکزِ ادب سے شائع ہوئے۔ مولانا اقبال سہیل پر لکھے گئے مضامین اور ان کی وفات پر لکھے گئے وفیاتی مضامین کو بھی ان مجموعوں میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ البتہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور عبدالرزاق قریشی مرحوم کے علامہ سہیل پر نہایت عمدہ وفیاتی مضامین شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا اقبال سہیل مرحوم پر شعرا کی جو منظوم نگارشات منظرِ عام پر آئیں اور جن میں سے بعض 'افکارِ سہیل' میں شامل ہیں، بعض اضافوں کے ساتھ انھیں بھی دوبارہ شائع کیا جانا چاہیے۔

مولانا اقبال احمد سہیلؔ اردو وفارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے اور وہ ان دونوں میں اپنے عہد میں عدیم النظیر قرار دیے جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جس صنفِ سخن میں داد دی اسے اوجِ ثریا تک پہنچا دیا ہے۔ معاصر شعرا بالخصوص نقادوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کا کوئی جواب نہیں اور سچ تو یہ بھی ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کے موثرات اب تک قائم ہیں۔

قصیدہ نگاری اور نعت نگاری اور خاص طور سے ان کا نعتیہ قصیدہ 'موجِ کوثر' پورے نعتیہ سرمایۂ ادب میں نہایت حسین وجمیل تخلیق اور گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نعت نگاری کی بھی اردو کے بلند پایہ ادیبوں اور نقادوں نے تحسین وستائش کی ہے۔ بہرکیف سہیل شناسی میں افتخار اعظمی کا بڑا اہم حصہ ہے۔ مقالہ 'ذکرِ سہیل' کی کتابی صورت میں اشاعت بلاشبہ سہیل شناسی میں بڑا قیمتی اضافہ قرار دیا جائے گا۔

شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com, Mob. 9838573645

افتخار اعظمی: جنھیں بھلا دیا گیا

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

افتخار اعظمی (1929-1994) مولانا اقبال احمد خاں سہیلؔ (1884-1955) کے خاص شاگرد اور اردو کے ممتاز ادیب وشاعر اور نقاد تھے۔ موضع جے گہاں ضلع اعظم گڑھ میں 1929 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلا تعلیم انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ وہ مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے سمدھی عبدالغنی انصاری مرحوم (م: اگست 1962) انکم ٹیکس افسر کے بھتیجے اور عبدالعلی انصاری مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ نہایت عمدہ ادیب ونقاد اور قدیم ادبیات کے ساتھ جدید علوم وفنون اور ادبیات پر گہری اور باریک نگاہ والے اہلِ قلم اور شاعر تھے۔ انگریزی ادب کے بھی ماہر تھے۔ علمِ فلالوجی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ دبستانِ شبلی میں علمِ فلالوجی پر سب سے گہری نگاہ تلمیذِ شبلی اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے سابق رفیق مولانا ابوالجلال ندوی (1894-1984) رکھتے تھے۔

اس طرح افتخار اعظمی دبستانِ شبلی کے دوسرے اہلِ قلم تھے جنھیں علم فلالوجی سے گہرا شغف تھا۔ گویا ان کی شخصیت میں اجتماعِ ضدین تھا۔ ان دونوں علوم کا ان کی ذات میں یکجا ہونا واقعتاً ایک بڑی اہم بات تھی۔ افتخار اعظمی اور بھی متعدد اوصاف وخصوصیات کے حامل ادیب وشاعر تھے۔ مثلاً وہ ایک نہایت عمدہ غزل گو، نظم نگار اور ایک بڑے خطیب ومقرر بھی تھے۔ وہ جب تقریر کرتے تھے تو مجمع پر چھاجاتے اور اپنے اندازِ خطابت سے مجمع پر ایک سماں باندھ دیتے تھے۔

پھر ان کی زندگی میں انقلاب آیا اور انھوں نے لکھنؤ کے مرکزِ ادب جہاں گیرآباد پیلس چھوڑ کر لندن کا رخ کیا اور بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے وابستہ ہوگئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنے طور پر اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی۔ 4 اپریل 1994 کو اردو کے اس شاعر و ادیب نے دیارِ غیر میں ہی داعیِ اجل کو لبیک کہا اور لندن ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ ان کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ یا غالباً ناچیز کی ان تک رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

افتخار اعظمی نے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ شاعری بھی کی اور ادبی وتنقیدی مضامین ومقالات بھی لکھے۔ ان کی متعدد تحریریں راقم کی نظر سے گزری ہیں جو اس مقام ومرتبہ کی ہیں کہ ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اولاً ان کی تحریرات وتخلیقات کو مرتب کرکے اہلِ ذوق کی خدمت میں پیش کیا جانا چاہیے۔ خاص طور پر ان کا مقالہ علامہ حمیدالدین فراہی بڑا عمدہ اور محققانہ مقالہ ہے جو ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ (دسمبر 1955) میں شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ اور بعض دیگر رسائل میں افتخار اعظمی صاحب کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ 'نئی نسلیں' لکھنؤ کے محض چند شمارے ایک موقع پر یکجا دیکھنے کو ملے۔ اس میں 'تصورِ حسن وعشق: تعمیری نقطۂ نظر سے' (اگست 1954) عربی دنیا کا سب سے پہلا اسلامی شاعر حسانؓ بن ثابت (مئی جون 1954) یومِ بدر، حضرت حسانؓ بن ثابت مترجمہ: افتخار اعظمی، فروری 1954) وغیرہ مضامین نظر آئے۔ ان سے ان کے علمی وادبی ذوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی عمدہ نثر اور ان کا اندازِ تحریر وتجزیہ اور خاص طور پر سادہ وشستہ اور شگفتہ اسلوب بہت متاثر کرتے ہیں۔ یہی حال ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی ہے۔ وہ نہایت عمدہ نظمیں اور غزلیں کہتے تھے۔ ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ کے محض چند شماروں میں ان کی درج ذیل تخلیقات شائع ہوئی ہیں:

نظم: چاندنی رات میں، جولائی 1954 (ص 21)۔ ناز شہیداں نہ رہا، ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ، سال گرہ نمبر (شمارہ 1,2,3، 1956) آخرالذکر نظم اصلاً مرثیہ ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ کس شخص کا مرثیہ ہے۔ ناچیز کا خیال ہے کہ یہ غالباً اقبال احمد سہیل مرحوم کا مرثیہ ہے جن کے وہ بہت بڑے شیدائی تھے۔

غزل: ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ: اکتوبر 1954، ص 16۔ فروری 1955، ص 43۔ دسمبر 1955 (ص 36-35) یہاں ان کی مختلف غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

مجھے حضور کے وعدوں پہ اعتبار نہیں
ابھی تو عہدِ محبت بھی استوار نہیں
اسے تلاش ہے کس کی مجھے نہیں معلوم
نگاہِ شوق کو آخر یہ کیوں قرار نہیں
خزاں کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار ابھی
ہمیں نصیبِ چمن پر کچھ اختیار نہیں
یہ کس نے لوٹ لیا آہ! غنچہ وگل کو
چمن میں کوئی جگر گوشہ بہار نہیں

بنے یہ عالم خاکی بہشت ذوقِ نظر
چمن چمن جو ہو گلگشت موج بادِ سحر
سلام شوق تجھے اے نشانِ منزل دوست
یہیں لٹا تھا مرا کاروانِ فکر و نظر

بہت بلند ہے شاید مرا مذاق جنوں
بتِ فرنگ کا ہرگز چلا نہ مجھ پہ فسوں
جو رازہائے محبت ہیں میرے سینے میں
غمِ حیات سے فرصت ذرا ملے تو کہوں
شبِ حیات کو بخشوں گا میں فروغِ سحر
کہ میرے دل میں ہے روشن چراغ سوزِ دروں

تابش سہیل اور ارمغانِ حرم

افتخار اعظمی مرحوم کی غزلوں کے اشعار ماہنامہ 'نئی نسلیں' لکھنؤ کے مختلف شماروں سے نقل کیے ہیں۔ ان سے اگر سخن سنجی کا اظہار ہوتا ہے تو انھوں نے سخن فہمی کے متعدد نمونے بھی شائع کیے ہیں۔ سہیل شناسی میں ان کا بڑا اور قابلِ ذکر کارنامہ مولانا اقبال احمد خاں سہیل کی غزلوں کے مجموعے 'تابش سہیل' اور نعت ومنقبت کے مجموعے 'ارمغانِ حرم' کی ترتیب وتدوین، تقدیم وتحشیہ اور طبع واشاعت ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مجموعۂ غزلیات 'تابش سہیل' مرکزِ ادب جہاں گیرآباد، لکھنؤ سے 1958 میں پہلی بار افتخار اعظمی کی ترتیب وتدوین اور دیباچے کے ساتھ شائع ہوکر نہایت مقبول ومشہور رہا۔ سہیل شناسی کے حوالے سے افتخار اعظمی کا دوسرا تدوینی کارنامہ 'ارمغانِ حرم' کی ترتیب وتدوین اور طبع و اشاعت ہے۔ 'ارمغانِ حرم' اقبال سہیل مرحوم کی نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی مرکزِ ادب لکھنؤ کے جہاں گیرآباد پیلس سے 1960 میں شائع ہوا ہے۔ یہ دونوں مجموعے سہیل مرحوم کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے بہترین نمونوں سے مزین ہیں اور ان دونوں کی اشاعت افتخار اعظمی کی علمی تگ ودو اور ادبی مذاق کی مرہونِ منت ہیں۔

ان مجموعوں میں افتخار اعظمی نے مقدمہ، پیش لفظ کے علاوہ حیات سہیل، ذکرِ سہیل اور سہیل مرحوم پر دیگر اہلِ قلم کی نگارشات جو علامہ سہیل مرحوم کی شاعری اور ان کے فکروفن سے متعلق ہیں شامل کی گئی ہیں اور ان مجموعوں میں سہیل صاحب مرحوم کی شخصیت اور شاعری کا خاصا ذکر موجود ہے۔

ذکرِ سہیل

اب اسے ہماری بے حسی کہا جائے یا کچھ اور کہ سوائے 'کلیاتِ سہیل' کے علامہ سہیل مرحوم کا کوئی مجموعۂ نظم ونثر اب تک دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ نہ تابش سہیل، نہ ارمغانِ حرم اور نہ افکارِ سہیل اور نہ موجِ کوثر۔ بڑی محنت اور نہایت تلاش وتحقیق سے افتخار اعظمی نے 'ذکرِ سہیل' لکھا ہے جو ستمبر 1956 کے 'اردو ادب' علی گڑھ کے دوسرے شمارے میں ایک طویل مقالے کی صورت میں چھپا ہے مگر وہ افتخار اعظمی کی اصلاً ایک مکمل کتاب ہے۔ اسے آج تک کتابی صورت میں چھاپنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ یہاں اختصار سے اس کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

اس میں پہلے پس منظر کے طور پر سہیل صاحب کے خانوادے اور ان کے وطن اور جائے پیدائش وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی میں ان کی سیرت وشخصیت کا بھی بیان ہے۔ پھر ان کی شاعری کا ذکر ہے اور ان کے اساتذہ ومعاصرین نے ان کے کلام بالخصوص ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722